دسواں باب ۱۰

اولیاء اللہ کون ہیں؟

اس باب میں بعض ایسی باتیں بھی ملیں گی جو سابقہ صفحات میں آچکی ہیں
لیکن موضوع میں ربط کے لئے انہیں دُہرا دینا ضروری سمجھا گیا ہے

"اولیاء اللہ" کے الفاظ سنتے ہی ہمارا ذہن ایک خاص طبقہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جسے عام انسانوں ہی سے نہیں، بلکہ جماعتِ مومنین سے بھی منفرد اور الگ تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیات ایسی ہیں جو دوسرے مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی تعلیم الگ۔ ان کی "عبادت" (ریاضت) کے طور طریق مختلف، ان کا رہن سہن باقی لوگوں سے جداگانہ۔ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ دوسروں کے دلوں کے حالات سے واقف ہیں۔ ہر آنے والے کے متعلق پہلے ہی جان لیتے ہیں کہ وہ کیا مانگنے آیا ہے۔ مستقبل کے واقعات سب ان کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں، وہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ قضا و قدر پر ان کا کنٹرول سمجھا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں، بگڑی بنا دیتے ہیں، تقدیریں بدل دیتے ہیں، قسمت کا لکھا مٹا دیتے ہیں، ان کا غصہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ان کی خوشنودی دنیا و آخرت سنوار دیتی ہے، انہوں نے جس کی طرف نگہ کرم سے دیکھ لیا، اس کا بیڑا پار ہو گیا، جس سے رُخ پھیر لیا وہ کہیں کا نہ رہا۔ ان کا ماننے والا جہاں بھی انہیں پکارے وہ اس کی سنتے ہیں، اس کی پکار کا جواب دیتے ہیں اور اس کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ ان سے ایسی ایسی کرامات سرزد ہوتی ہیں جن سے عقل دنگ رہ جاتی ہے، وہ جب تک جی چاہے دنیا میں رہتے ہیں۔ جب چاہیں یہاں سے "پردہ کر لیتے ہیں"۔ (وہ مرتے نہیں، صرف لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ وہ دنیا میں ہوتے

اولیاء اللہ کی خصوصیات

ہوئے لوگوں کے سامنے کرتے تھے وہی کچھ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر کرتے ہیں)، وہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کی دعائیں بدستور سنتے ہیں۔ ان کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ ان کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ وہ جیتے جی بھی دربارِ خداوندی میں جاتے تھے، مرنے کے بعد بھی وہیں ہوتے ہیں۔ محکمۂ قضا و قدر کی طرف سے، دُنیا کا نظم و نسق ان کے سپرد ہوتا ہے۔ جس طرح دنیاوی حکومتوں کی طرف سے مختلف کارپردازان مقرر ہوتے ہیں ــــ گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ۔ اسی طرح محکمۂ قضا و قدر کی طرف سے دنیاوی امور کا انتظام و انصرام "اولیاء اللہ" کے سپرد ہوتا ہے۔ ان کے بھی مختلف مدارج و مناصب ہوتے ہیں اور انہی کے اعتبار سے مختلف امورِ مملکت ان کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ظاہری حکومت کے کارندے، گورنر کمشنر وغیرہ یونہی کٹھ پتلیاں ہوتے ہیں جو ان حقیقی کارپردازانِ قضا و قدر کے فیصلوں کی تعمیل کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔ غرضیکہ کائنات کا سارا نظم و نسق انہی کے سپرد ہوتا ہے، اور جو کچھ ہوتا ہے سب انہی کے اشاروں سے ہوتا ہے۔ جب ان کا کوئی معتقد مرنے کے بعد قبر میں منکر نکیر کے عذاب سے ڈر کر ان کی دہائی دیتا ہے تو یہ وہاں بھی اس کی مدد کو پہنچتے ہیں اور جب قیامت میں ہر طرف نفسا نفسی ہو گی تو یہ اپنے مریدوں کو سیدھے جنّت میں لے جائیں گے۔

صحابہؓ کا شمار بھی ان میں نہیں ہوتا

اس گروہ کے عام جماعتِ مؤمنین سے الگ اور منفرد ہونے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب "اولیاء اللہ" کہا جاتا ہے تو کسی کا خیال نہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف جاتا ہے نہ عمر فاروقؓ کی طرف۔ نہ خالدؓ سیف اللہ اس زمرہ میں شریک دکھائی دیتے ہیں، نہ عمروؓ بن العاص۔ ان کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ (مثلاً) ان کے عُرسوں کی تاریخیں ہر وقت، ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے رہتی ہیں۔ لیکن اگر آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تاریخِ وفات یا حضرت عمرؓ کے سنِ شہادت کے متعلق دریافت کریں تو شاید سَو میں سے دس مسلمان بھی نہ بتا سکیں۔ ان کے مزارات کی عظمت کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک قبر پر لاکھوں روپے کی عمارات قائم ہوں گی اور ہزاروں روپے کے غلاف چڑھیں گے۔ لیکن اس کا علم شاید ایک فی صد مسلمانوں کو بھی نہ ہو کہ (مثلاً) حضرت عثمانؓ کہاں دفن ہوئے تھے اور ان کے مزار کی آج کیا حالت ہے؟ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی کسی کرامت کا ذکر تک آپ نے کہیں سے نہیں سنا ہو گا۔ لیکن سائیں "بھورے شاہ" اور "کھونڈی شاہ" کی کرامات کے چرچے ہر خاص و عام کی زبان پر ہوں گے۔ آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہو گا کہ میں حضرت عمرؓ کی نیاز دے رہا ہوں۔ اس کے برعکس "حضرت شاہ لنگھی" کی نیاز کی دیگوں کی آواز ہر تیسرے دن سنائی دے گی۔

"اولیاء اللہ" کے اس خاص گروہ کا تصور، جہلاء تک ہی محدود نہیں، مسلمانوں کا بلند پایہ علمی طبقہ ـــ خواہ وہ علومِ شریعت کے حامل ہوں، یا دنیاوی علوم کے ماہر، ان کی ان خصوصیات کا معترف اور ان کی جداگانہ ہستی کا قائل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی اس میں ذرا مبالغہ سے کام لیتا ہے، کوئی اعتدال پر رہتا ہے۔ لیکن اس جداگانہ گروہ کے قائل سب ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا قرآنِ کریم بھی اس قسم کے کسی الگ گروہ کا ذکر کرتا ہے اور ان کی وہ خصوصیات بتاتا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے؟ قرآنِ کریم میں "ولی" کا لفظ بھی آیا ہے اور "اولیاء" کا بھی۔ بلکہ "اولیاء اللہ" کا بھی۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں اور قرآنِ مجید انہیں کن لوگوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ولی کے معنی

اَلْوَلْیُ کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا۔ قرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مددگار کو کہتے ہیں۔ اِسْتَوْلٰی عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے قبضۂ قدرت میں لے لینا، کسی پر غالب آجانا۔ اس اعتبار سے وَالِیْ نگران، ناظم اور حاکم کو کہتے ہیں۔ نیز اَلْوَلِیُّ بھی نگران اور حاکم کو کہتے ہیں۔

وَلّٰی کے متضاد معنی بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کی طرف رجوع کرنا بھی اور اس سے اعراض برتنا بھی۔ تَوَلّٰی عَنْہُ اس سے اعراض برتا۔ تَوَلَّاہُ اس کی پیروی کی۔ اسے اختیار کیا۔ اس اعتبار سے اَلْوَلِیُّ کے معنی اطاعت کرنے والا بھی ہوں گے۔

قرآنِ کریم میں:۔

(۱) خدا کو مومنین کا ولی کہا گیا ہے۔

(۲) مومنین کو خدا کا ولی بتایا گیا ہے۔ اور

(۳) مومنین کو ایک دوسرے کا ولی کہا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب خدا کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ مومنین کا ولی ہے تو اس کے بنیادی معنی نگران، سرپرست، حاکم، مطاع کے ہوں گے۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا

اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (۲/۲۵۷)

"اللہ ان لوگوں کا سرپرست، نگران، حاکم، مطاع ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اس کے برعکس، جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کی سرپرست، نگران، حاکم، مطاع غیر خداوندی سرکش قوتیں ہوتی ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔" انہیں قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا "ولی" نہ بناؤ۔ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ـــ (۴۲/۹) "کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو "اولیاء" (سرپرست، آقا، حاکم، مطاع) قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ ہی ہے جو حقیقی سرپرست اور کارساز ہے۔ وہ مُردوں تک کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔" خدا کو "ولی" (یا مولیٰ) تسلیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اطاعت صرف اسی کے قوانین کی کی جائے۔ اس میں کسی اور کی محکومیت کو شریک نہ کیا جائے۔ سورۂ کہف میں ہے۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) "اس کے سوا لوگوں کا کوئی ولی نہیں اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

خدا کی ولایت (سرپرستی، نگرانی، حفاظت) بھی اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو اس کے قوانین کی اطاعت کرے اور ان کے مقابلہ میں اپنے یا دوسروں کے جذبات اور خواہشات کا اتباع نہ کرنے لگ جائے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ "ان سے کہہ دو کہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہدایت ہی ایسی ہے جو حقیقی معنوں میں ہدایت کہلانے کی مستحق ہے۔" وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ (۲/۱۲۰) "اگر تم نے لوگوں کے خیالات کا اتباع کر لیا باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی (وحیٔ خداوندی) آ چکی ہے تو تم خدا کی ولایت و نصرت سے محروم ہو جاؤ گے۔" یعنی اس کی نصرت اور سرپرستی مشروط ہے اس سے کہ انسان اس کی نازل کردہ وحی کے مطابق چلے۔ دوسرے مقام پر ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۹-۱۵۰)

اے ایمان والو! اگر تم نے ان لوگوں کی اطاعت کی جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے تو یاد رکھو وہ تمہیں راہِ حق سے الٹے پاؤں پھرا دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کامیابیوں کے راستے پر گامزن ہو جانے کے بعد پھر

تباہیوں کے جہنم میں جا گرو گے۔ یہ لوگ تمہارے کارساز اور مطاع نہیں ہو سکتے۔ تمہارا کارساز اور مطاع، حامی و ناصر صرف خدا ہے۔ تم اس کی اطاعت اختیار کرو۔

یہ اطاعت قرآن کریم کی ہے۔ اس کے سوا کسی کی اطاعت اور اتباع جائز نہیں۔

اطاعت قرآن کی ہے

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (۷/۳)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے سوا اپنے خود ساختہ مطاعوں کا اتباع مت کرو۔ (یہ بڑی واضح بات ہے) لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم اس حقیقت کو نگاہ کے سامنے رکھو (تم اوروں کی اطاعت کرنے لگ جاتے ہو)۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ خدا کو اپنا "ولی" تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نازل کردہ قوانین کی اطاعت کی جائے۔ لیکن یہ اطاعت (معاذ اللہ) کسی مستبد حاکم کی اطاعت نہیں۔ اس سے خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے (اور یہ ولایت کا دوسرا مفہوم ہے)۔ رفاقت کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں خدا کا ایک پروگرام جاری ہے۔ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے، انسان اس پروگرام کی تکمیل میں ممد و معاون ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں، خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید و نصرت اس کے شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ اس طرح خدا اور بندہ ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔ پھر، جماعتِ مومنین، قوانینِ خداوندی کو انسانی دنیا میں نافذ کرتی اور ان کے مطابق نظامِ معاشرہ قائم کرتی ہے۔ یعنی انسانی دنیا میں نظامِ خداوندی انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوتا ہے اور یہی نظام ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے جنہیں (انسانی دنیا میں) اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ یہ خدا اور بندوں کی رفاقت کی بڑی نمایاں شکل ہے۔

ولی اللہ کے معنی

اب ہم اس موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آتے ہیں ــ اور وہی گوشہ اس وقت بنیادی طور پر ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یعنی جب کسی انسان کو "ولی اللہ" یا انسانوں کی جماعت کو "اولیاء اللہ" کہا جائے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ مومن اور متقی ہی ہوتے ہیں۔ ان سے الگ ان کا کوئی اور گروہ نہیں ہوتا۔ یعنی مومن اور متقی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطیع و فرماں پذیر، اور اس کے دین کی مدد کرنے والے ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر جس طرح صالح، شہید،

صدیق ہونا مؤمن کی صفات ہیں۔ اسی طرح اس کا "ولی اللہ" ہونا بھی اس کی ایک صفت اور خصوصیت ہے چنانچہ سورۂ یونس میں ہے:۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۰/۶۲)

سُن رکھو! کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

آپ قرآن کریم کے اوراق پر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ مؤمنین کی صفت بتائی گئی ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے ہدایت خداوندی کے اتباع کا۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع میں نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) "تمہارے پاس میری طرف سے راہ نمائی آتی رہے گی۔ سو جو لوگ میری راہ نمائی کا اتباع کریں گے، انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔" اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۶۲) "جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور صلاحیت بخش کام کرے تو ان لوگوں کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا اور وہ اجر یہ ہے کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔" اس سے بھی واضح ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی خصوصیت مؤمنین کے کسی خاص گروہ کی نہیں، سارے مؤمنین کی صفت ہے۔

ان تصریحات کے بعد پھر سورۂ یونس کی اس آیت کی طرف آیئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ اور دیکھئے کہ اس سے اگلی آیت نے کس طرح اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے کہ "اولیاء اللہ" مومنین سے الگ کوئی جماعت نہیں۔ جو آیت پہلے درج کی گئی ہے وہ یہ ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ "سُن رکھو کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔" اس کے بعد ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۱۰/۶۳) "یعنی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کی۔" یہاں دیکھئے قرآن کریم نے کس طرح اولیاء اللہ کی تشریح یہ کہہ کر کر دی کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔ یعنی یہ مؤمنین اور متقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ ان سے الگ کوئی گروہ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ مؤمن اور متقیوں میں سے بعض اولیاء اللہ ہو جاتے ہیں اور باقی صرف مومن اور متقی رہتے ہیں۔ ہر تقوے شعار مؤمن ولی اللہ ہوتا ہے۔ یعنی خدا کا مطیع و فرماں بردار۔ اس کا رفیق۔

ہمارے ہاں اولیاء اللہ کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھٹے پرانے کپڑے پہننے کو

ایک کمبل یا گدڑی اوڑھنے بچھونے کو۔ دنیا کی تمام لذّات اور حظائظ سے کنارہ کشی۔ ہر خوشگوار شے سے نفرت۔ ایک بہت بڑے "ولی اللہ" حضرت فضیل ابنِ عیاضؒ کے الفاظ میں، ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ:۔

اگر دنیا، اس کی تمام دلچسپیوں کے ساتھ مجھے دے دی جائے اور اس پر کسی محاسبہ کا اندیشہ بھی نہ ہو، تب بھی میں اُسے ایسا ہی ناپاک سمجھوں گا جیسے تم مُردار کو ناپاک سمجھتے ہو۔

دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں

لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان اولیاء اللہ ـــ یعنی مومنین متقین کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ "انہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور مرفہ الحالیاں حاصل ہوتی ہیں اور اُخروی زندگی میں بھی کامیابیاں اور کامرانیاں"۔ اور یہ بات محض ہنگامی اور اتفاقی نہیں ہوتی۔ نہ ہی یہ کہ یہ اُن میں سے بعض کو حاصل ہوں اور دوسروں کو نہ ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ ایسا ہوگا۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہمیشہ ہوگا۔ اولیاء اللہ یعنی جماعتِ مومنین کی دنیاوی زندگی بھی خوشگواریوں کی ہوگی اور اُخروی زندگی بھی۔ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰/۶۴) اور یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے۔

نزولِ ملائکہ

"اولیاء اللہ" کے متعلق یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ "ملاءِ اعلیٰ" کے ساتھ ان کا خاص تعلق ہوتا ہے۔ ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ بھی مومنین کے کسی خاص گروہ کی خصوصیت نہیں۔ تمام مومنین کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ ان پر "نزولِ ملائکہ" ہوتا ہے جو انہیں اس دنیا کی زندگی اور اُخروی زندگی میں خوشگواریوں کی بشارت دیتے ہیں۔ سورۂ حٰمٓ السجدہ میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰)

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے اور پھر اپنے اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے تو ان پر (سکون و طمانیت کے حامل) فرشتے نازل ہوتے ہیں (جو اُن سے کہتے ہیں کہ) مت خوف کھاؤ، غمگین نہ ہو اور اس جنّت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

وہ اُن سے کہتے ہیں کہ:۔

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ

وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (۴۱/۳۱)

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور دوست ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی. تمہارے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی وہ سب کچھ ہوگا جس کی تمہیں آرزو ہوگی اور اُخروی زندگی میں بھی. تمہیں یہاں بھی وہ سب کچھ ملے گا جو تم مانگو گے اور اس زندگی میں بھی.

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور استقامت کا لازمی نتیجہ نزولِ ملائکہ ہے اور یہ کسی خاص گروہ کی خصوصیت نہیں. یہ پوری کی پوری جماعتِ مؤمنین کے لئے ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اس دنیا میں بھی وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی وہ خواہش کرتے ہیں. اور آخرت میں بھی ایسا ہی ہوگا. مومن جو مانگے اُسے ملتا ہے. اس دنیا میں بھی، اور اس دُنیا میں بھی. اس لئے وہ مانگتا ہی وہ کچھ ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق مل سکتا ہے. وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۶/۳۰). ظاہر ہے کہ جب جماعتِ مومنین کو ان کے ایمان و عملِ صالح کے نتیجہ میں استخلاف فی الارض حاصل ہو جائے گا تو ان کی ہر مانگ پوری کیوں نہیں ہوگی؟ واضح رہے کہ ان کی یہ مانگ کسی مافوق الفطرت طریقہ سے پوری نہیں ہوتی. فطرت کے قاعدوں کے مطابق پوری ہوتی ہے. وہ تسخیرِ فطرت کرتے اور فطرت کی مسخر کردہ قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں. اس طرح ان کی ہر مانگ پوری ہوتی جاتی ہے. یہی نزولِ ملائکہ ہے. اشیائے فطرت کی تسخیر سے انہیں اس زندگی میں ہر قسم کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور چونکہ وہ ان قوتوں کی تقسیم قوانینِ خداوندی کے مطابق تمام نوعِ انسان کی مرفہ الحالی کے لئے کرتے ہیں. اس لئے ان کی اُخروی زندگی میں بھی کامرانیوں اور سرفرازیوں کی زندگی ہوتی ہے. علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

موت کی تمنا کرنے والے

قرآنِ کریم کی رُو سے، مومن کی زندگی کا مقصود، مستقل اقدار کی حفاظت ہوتا ہے. جب کبھی ایسا ہو کہ مستقل اقدار اور اس کے ذاتی رجحان یا مفاد میں TIE پڑ جائے تو وہ اپنے ذاتی رجحان یا مفاد کو مستقل قدر پر قربان کر دیتا ہے. حتّٰی کہ اگر ایسا وقت آجائے کہ اُسے کسی بلند مستقل قدر کے تحفظ کی خاطر جان دینی پڑ جائے تو وہ بلا تامّل جان بھی دے دیتا ہے. قرآنِ کریم نے اسے دعوائے ایمان کی صداقت کا TEST قرار دیا ہے. یہود کا دعویٰ تھا کہ وہ اللہ کے پیارے اولیاء اللہ ہیں. ان سے کہا گیا کہ اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۶۲/۶) "اگر

تم سمجھتے ہو کہ دوسرے لوگ نہیں، صرف تم ہی اللہ کے دوست ہو، تو اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی آرزو کر کے دکھاؤ۔" واضح رہے کہ موت کی تمنا سے مراد وہ نفس کشی نہیں جو ہمارے ہاں "اولیاء اللہ" کی نشانی بتائی جاتی ہے۔ نفس کشی کا تصور ہی غیر قرآنی ہے اور عیسائی رہبانیت، ہندوؤں کے یوگ اور بدھوں کے نروان سے لیا گیا ہے۔ قرآن کی رُو سے موت کی تمنا سے مراد ہے قتال فی سبیل اللہ۔ خدا کی راہ میں جنگ کرنا اور اس طرح دین کی محافظت کے لئے کفن بدوش اور سر بکف دشمن کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آنا۔ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (۹/۱۱۱) "وہ خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پھر یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں یا میدانِ جنگ میں جان دے دیتے ہیں۔" خانقاہوں میں بیٹھے اپنے نفس کے خلاف "جہادِ اکبر" میں مصروف رہنا قرآن کی رُو سے "قتال فی سبیل اللہ" نہیں۔ یہی وہ جماعتِ مومنین ہے جسے قرآن نے "حزبُ اللہ" کہہ کر پکارا ہے۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲)۔ ان کے برعکس، غیر مسلموں کو اس نے "حِزْبُ الشَّيْطَان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (۵۸/۱۹)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، پوری کی پوری جماعتِ مومنین کا نام "اولیاء اللہ" ہے۔ خدا کا ولی ہونا ان کی خصوصیت ہے۔ اس جماعت کے اندر اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اولیاء اللہ کا ایک الگ گروہ تصور کیا جاتا ہے اور ان کی خصوصیات بھی عام جماعتِ مومنین سے جداگانہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ وہ نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی لئے لوگ اپنی مُرادیں مانگنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں۔

نفع و نقصان کی قدرت نہیں

قرآنِ کریم کی رُو سے یہ عقیدہ توہم پرستی کا پیدا کردہ، فلہٰذا نہایت کمزور اور بودا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹/۴۱) "وہ لوگ جو اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تصور اور تسلیم کرتے ہیں، ان کی مثال مکڑی کی سی ہے۔ وہ ایک گھر بناتی ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کا گھر کس قدر کمزور اور بودا ہوتا ہے۔ اے کاش! لوگ علم و بصیرت سے کام لے کر سوچتے کہ ان کے اس قسم کے عقائد کس قدر جہالت پر مبنی ہوتے ہیں۔" جہاں تک کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کا تعلق ہے، قرآن کہتا ہے کہ یہ تو اپنی ذات کے لئے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، چہ جائیکہ دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ

لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا (۱۳/۱۶) "ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہو جن کی حالت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اقتدار نہیں رکھتے۔" عام "اولیاء اللہ" تو ایک طرف، اس باب میں تو اُس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے متعلق جن کا مقام یہ ہے کہ ـــ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ـــ خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (۱۰/۴۹) "ان سے کہو کہ میں تو خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے۔"

یہ خُدا کا مقرّب بنا دیں گے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم ان "اولیاء اللہ" کی طرف اس لئے رجوع کرتے ہیں کہ چونکہ یہ خود مقرّبینِ بارگاہِ خداوندی ہیں اس لئے یہ ہمیں بھی خدا کا مقرّب بنا دیں گے۔ ہم ان کی اطاعت، قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی سختی سے تردید کی ہے۔ سورۃ الزمر میں ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ "ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، سو تم اس کتاب کے مطابق، خدا کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو اور اس اطاعت کو اس کے لئے مختص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک مت کرو۔" اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ "پھر سُن رکھو کہ اطاعت خالصتہً احکام و قوانینِ خداوندی کی ہو گی جو اس نے اس کتاب میں دے رکھے ہیں۔" وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ "جو لوگ، خدا کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کر لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی اطاعت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کا مقرّب بنا دیں گے۔" اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ "اللہ ان کی ان باتوں کا ابھی فیصلہ کرتا ہے جن میں یہ (دین کی اصل و حقیقت سے) اختلاف کرتے ہیں۔" اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ (۳۹/۲-۳) "جو جھوٹا اور ناشکر گزار ہے، خدا اسے کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔" یاد رکھو! مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ۔ "صحیح راستے پر وہی ہے جو خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔" وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (۱۸/۱۷) "اور جو اس کی رہنمائی کو چھوڑ کر، اور راہیں اختیار کرے، تو اس کا نہ کوئی ولی ہو سکتا ہے نہ مُرشد۔" مرشد (صحیح راستہ دکھانے والا) اور ولی (جس کی اطاعت کی جائے) صرف خدا کی ذات ہے اور اس کی اطاعت اس کتاب کے ذریعہ کی جاتی ہے جسے اس نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے نازل کیا ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اولیاء اللہ" خدا تک پہنچنے (یا ہماری دعاؤں کو خدا تک پہنچانے) کا وسیلہ

یہ وسیلہ ہیں

(ذریعہ) ہیں اور ہم اسی مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عقیدہ کی تائید میں سورۂ مائدہ کی یہ آیت پیش کردی جاتی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۵/۳۵) اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یہ ہے۔ "اے ایمان والو! تم اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو اور اس کی طرف "وسیلہ" طلب کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔" اس لفظ "وسیلہ" سے پیر پرستی کی دلیل لائی جاتی ہے۔ اور پھر اس پر اشخاص پرستی کی وہ عظیم عمارت قائم کردی جاتی ہے جسے ڈھانے اور مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جو نبیٔ اکرمؐ کی بعثت کا مقصد تھا۔ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷) "یہ رسول ان بوجھل سلوں کو تمہارے سروں سے اتار دے گا جن کے نیچے تم دبے چلے آرہے ہو اور ان زنجیروں کو کاٹ کر الگ کردے گا جن میں تمہاری آزادی جکڑی ہوئی ہے۔" یہ بوجھل سلیں اور زنجیریں شخصیت پرستی کی تھیں جن سے آزادی دلانے کے لئے حضورؐ کو مبعوث کیا گیا تھا۔

عربی زبان میں لفظ "وسیلہ" کے معنیٰ ذریعہ ہی نہیں بلکہ مرتبہ، درجہ، قرب، منصب، منزلت بھی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور خدا کے ہاں بلند مرتبہ، درجہ، قُرب، منزلت طلب کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ کے راستے میں پوری پوری جدوجہد کرتے رہو۔ اس سے تم ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یہ مفہوم کہ تقوےٰ سے خدا کے ہاں درجہ اور منزلت حاصل ہو جاتی ہے، قرآن کے متعدد مقامات سے واضح ہے۔ مثلاً اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳) "خدا کے ہاں تم میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔" اور اگر "وسیلہ" کے معنیٰ "ذریعہ" لئے جائیں تو بھی مطلب واضح ہے کہ تم تقویٰ اور جہاد کے ذریعہ خدا کے ہاں قدر و منزلت طلب کرو۔ قرآن، خدا اور انسان کا براہِ راست تعلق قائم کرتا ہے اور یہ تعلق

خُدا اور اِنسان کا براہِ راست تعلّق

اس کی کتاب کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ یعنی خدا اور بندوں میں تعلق کا واسطہ اس کی کتاب ہے جس کے مطابق عمل کرنے سے انسان خدا کا عبد بن جاتا ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان دوسرے انسانوں کے ذریعہ بننے کا تصور غیر قرآنی ہے۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ "جب (اے رسولؐ) تجھ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔" اتنا قریب کہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ "میں ہر اس شخص کی پکار کا، جو مجھے پکارتا ہے، جواب دیتا ہوں۔" لیکن اس

کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (۲/۱۸۶) "انہیں چاہیئے کہ میری فرماں برداری اختیار کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ انہیں رشد و ہدایت مل جائے۔" بات کس قدر صاف ہے۔ جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے لوگ "مرشد" تلاش کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ سمجھئے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا۔ نہ سیاست میں حکمران کی طاقت کو۔ نہ رزق کے معاملہ میں سرمایہ دار کی طاقت کو۔ نہ مذہب میں پیشوائیت کی طاقت کو۔ (اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ عناصر ہیں ہی نہیں) اور نہ "خدا اور بندے کے تعلق" کے لئے پیرانِ طریقت کی طاقت کو۔ اس کتاب کے ذریعے ہر شخص کا خدا سے براہِ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس کی اطاعت اس نظام کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس مقصد کے لئے باہمی مشاورت سے متشکل کیا جاتا ہے۔ خدا نے اپنی کتاب (قرآنِ مجید) کو کلام اللہ کہا ہے۔ اس لئے جب کوئی شخص قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو خدا اس کے ساتھ کلام کر رہا ہوتا ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد، خدا سے ہمکلام ہونے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔

"اولیاء اللہ" کے غلط تصور کی رُو سے خدا اور انسانوں کے درمیان، اس کے "خاص بندوں" کی کڑی کو کس قدر لاینفک سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس حکایت سے لگایئے جو خانقاہیت کی تعلیم گاہوں میں سب سے پہلے ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔

یا فرید۔ یا فرید

حکایت یہ ہے کہ حضرت بابا فریدؒ دریا کے اِس پار رہتے تھے اور اُن کی خانقاہ دریا کے اُس پار۔ وہ ہر صبح گھر سے نکلتے۔ آگے آگے آپ، پیچھے پیچھے آپ کا ایک مُرید۔ دریا کے کنارے پہنچتے تو، کسی پُل یا کشتی کے بغیر، پانی پر سیدھے چلتے ہوئے اُس پار پہنچ جاتے۔ اسی طرح شام کو واپس آجاتے۔ مُرید سے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ پانی پر چلتے وقت یا فرید! یا فرید!! پکارتے رہا کرو۔ اس طرح برسوں گزر گئے۔ ایک دن، پانی پر چلتے، مُرید نے سُنا کہ خود بابا صاحبؒ بھی کچھ الفاظ دہرا رہے ہیں۔ اس نے کان لگا کر سُنا تو وہ کہہ رہے تھے۔ یا اللہ! یا اللہ!! مُرید نے دل میں سوچا کہ میں بھی "یا فرید" کے بجائے "یا اللہ" ہی کیوں نہ کہوں۔ اس نے جونہی "یا اللہ" کہا، دھڑام سے پانی میں گر گیا اور لگا غوطے کھانے۔ بابا صاحبؒ نے اسے سنبھالا اور کنارے پر آکر پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا! اس نے ڈرتے کانپتے بات بتائی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے کبھی اللہ کو دیکھا ہے؟ تمہاری اس سے براہِ راست

لے یہ کہانی کئی اولیاؤں کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

کوئی راہ و رسم ہے؟ اس نے کہا نہیں. آپ نے فرمایا کہ جس سے تمہاری نہ جان پہچان، نہ راہ و رسم، اُسے تم اپنی مدد کے لئے کس طرح پکار سکتے ہو؟ فریدؒ کی خدا سے راہ و رسم ہے اس لئے وہ اسے پکارتا ہے. تمہاری فریدؒ سے راہ و رسم ہے، تم اُسے پکارو. جس دن تمہاری راہ و رسم خدا سے براہِ راست ہو جائے گی تم بھی اسے پکار لینا.

یہ اور اس قسم کی حکایات سے شروع ہی سے یہ چیز مُریدوں کے ذہن نشین کرا دی جاتی ہے کہ خدا کے مقرب بندے (اولیاء اللہ) خدا اور انسانوں کے درمیان لاینفک کڑی ہوتے ہیں. تم خدا سے براہِ راست اپنا رشتہ جوڑ ہی نہیں سکتے. یہ رشتہ مُرشد کی وساطت سے جُڑ سکتا ہے. مُرشدوں کے ساتھ یہ رشتہ ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں سمجھا جاتا ہے، ان کی وفات کے بعد بھی ان سے بدستور قائم رہتا ہے[1]. اس لئے کہ اولیاء اللہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح حاضر و ناظر رہتے ہیں جس طرح وہ زندگی میں سب کی سنتے ہیں. سب کچھ دیکھتے ہیں. مانگنے والوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں. خدا کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں. حالانکہ مُردوں کے متعلق قرآنِ کریم واضح الفاظ میں

مُردے ہماری سُن نہیں سکتے

کہتا ہے. وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ. "اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اُسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا. (جواب دینا تو ایک طرف) وہ ان کی پکار سے یکسر بے خبر ہوتے ہیں. انہیں اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ انہیں کون پکار رہا ہے." وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝ (۴۶/۶-۵) "اور جب لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا تو یہ (اپنے پکارنے والوں کے) دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے یکسر انکار کر دیں گے." یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ یہاں کفار کے بتوں کا یا ان کے دیگر معبودانِ باطل کا ذکر نہیں. ذکر خدا کے ان نیک بندوں کا ہے جنہیں لوگ ان کی وفات کے بعد اپنی مرادوں کے لئے پکارتے ہیں. اُن کا ان عقیدتمندوں کے اس قسم کے عقائد اور حرکات سے بری الذمہ ہونے کا اظہار، ان کے خدا کے مخلص بندے ہونے کی شہادت ہے. ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ اپنے پکارنے والوں کی پکار کو سُن ہی نہیں سکتے. حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے مرنے والوں کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا. ان کا تعلق

---

[1] جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اس باب میں کئی ایک موضوعات ایسے بھی آئیں گے جو پہلے بھی آ چکے ہیں. یہ تکرار معنوی ربط کی خاطر اختیار اور گوارا کی گئی ہے.

اُس دنیا سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سنتے ہی نہیں۔ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ۔ اور اگر بفرضِ محال وہ تمہاری پکار کو سُن بھی لیتے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔" وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ (۱۵-۳۵/۱۴)" اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک سے اظہارِ نفرت اور بیزاری کریں گے۔ یہ باتیں تمہیں وہ خدا بتا رہا ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں۔ وہ اس دنیا سے چلے جانے والوں کے احوال و کوائف سے اچھی طرح واقف ہے۔" یہاں بھی آیت کے دوسرے حصے سے واضح ہے کہ بات خدا کے ان نیک بندوں کی ہو رہی ہے جو اپنے ان عقیدت مندوں کے اس شرک سے متنفر ہوں گے۔ سوچئے کہ جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کے اس فعل کو شرک قرار دیتے ہیں اور یہ اُن کے عقیدت مند اور تابع فرمان بنتے ہیں۔

غیب کا علم کوئی نہیں جانتا

ان کے متعلق ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں اور خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔" ان سے کہہ دو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو۔" اور مُردوں کی تو حالت یہ ہے کہ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۲۷/۶۵)" انہیں اس کا بھی علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے[1]۔"

کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیات عام مُردوں سے متعلق ہیں۔ شہیدوں سے متعلق نہیں۔ شہید زندہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان اولیاء اللہ کو شہیدوں کے زُمرے میں شامل کر دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے نفس کو مار دیا ہوتا ہے۔" بلکہ ان کا رتبہ شہدا سے بھی بڑھ کر بتایا جاتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ ؏

اُو کشتۂ دشمن است، ایں کشتۂ دوست

---

[1] علمِ غیب کے متعلق اور تو اور خود رسولؐ اللہ سے ارشاد ہے، قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶/۵۰)" ان سے کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم جانتا ہوں۔" اللہ تعالیٰ آپ کو (اور دوسرے رسولوں کو) جن امورِ غیب کا علم دینا چاہتا ہے وہ وحی کے ذریعے دے دیتا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا، ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (۳/۴۳)" یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جسے اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔" چونکہ وحی نبیٔ اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی اس لئے حضورؐ کے بعد کسی کو غیب کا علم حاصل ہونے کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ جو غیب کے علم کا دعوےٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوت کا دعوےٰ کرتا ہے۔

شہداء کے متعلق

اس باب میں سب سے پہلے اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ "مقتولین فی سبیل اللہ" کے لئے "شہداء" کی اصطلاح قرآن میں نہیں آئی۔ قرآن کی رُو سے پوری کی پوری امتِ محمدیہ شہداء علی النّاس ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳) "اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنایا ہے۔ تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال کی نگرانی کرسکو اور رسولؐ تمہارے اعمال کی نگرانی کرے۔"

(۲) قرآنِ کریم میں "مقتولین فی سبیل اللہ" کے متعلق ہے:۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲/۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں، انہیں مُردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر ان کی زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ (۳/۱۶۸)

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں انہیں مردہ مت خیال کرو۔ وہ اپنے اللہ کے ہاں زندہ ہیں اور رزق پاتے ہیں۔

مقتولین فی سبیل اللہ کی یہ زندگی کس قسم کی ہے، اس کے متعلق بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ اس ضمن میں پہلے دو ایک باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) مقتولین فی سبیل اللہ کے جو خصوصی مراتب ہیں وہ انہی تک محدود نہیں جو میدانِ جنگ میں جان دے دیں وہ ان سب کے ہیں جو اللہ کی راہ میں جان دینے کے لئے تیار ہوں۔ مثلاً رسولؐ اللہ اور حضورؐ کے صحابہؓ ان تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے جو فی سبیل اللہ لڑی گئیں۔ ان میں سے بعض صحابہؓ میدانِ جنگ میں مقتول ہو گئے اور بعض فاتح و منصور، زندہ، واپس آ گئے۔ خود حضورؐ اور بہت سے صحابہؓ اس طرح مقتول نہ ہوئے بلکہ زندہ رہے۔ اگر ان خصوصی مراتب کو مقتولین تک محدود سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دیگر مجاہدین (جو میدانِ جنگ میں مقتول نہیں ہوئے اور خود رسولؐ اللہ) ان مراتب سے محروم رہ گئے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ محض اتفاقی امر

تھا کہ ان مجاہدین میں سے بعض میدانِ جنگ میں مقتول ہو گئے اور باقی زندہ واپس آ گئے۔ قرآنِ کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ ان مراتب میں یہ سب شریک ہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے، وَ لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَحْمَۃٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (۳/۱۵۶) "اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے جاؤ یا مر جاؤ تو تم اللہ کی مغفرت اور رحمت کے مستحق ہو گئے اور یہ متاعِ عظیم ہر اُس چیز سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں۔" اس سے واضح ہے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینے کا تہیہ کرنے والے اور اس کے لئے ہر وقت تیار رہنے والے خواہ مقتول ہوں یا ویسے ہی فوت ہو جائیں۔ ان کے مراتب یکساں ہوں گے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ مَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴/۷۴) "جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے، تو اس کے بعد وہ قتل ہو جائے یا دشمن پر غالب آ جائے تو ہم اُسے بہت بڑا اجر دیں گے۔" اسی حقیقت کو سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ (۹/۱۱۱) "وہ (مومنین) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور قتل ہو بھی جاتے ہیں۔" لہٰذا ان مراتب کے لئے میدانِ جنگ میں قتل (شہید) ہو جانا ہی شرط نہیں۔ لیکن اسے اچھی طرح سمجھ رکھنا چاہیئے کہ اس شہادت سے مراد چلّوں اور مراقبوں کی نفس کشی نہیں۔

(ب) یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مقتولین فی سبیل پر طبیعی موت PHYSICAL DEATH وارد ہی نہیں ہوتی۔ طبیعی موت، ہر ذی حیات کے لئے ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ (۳/۱۸۴) "ہر ذی حیات کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔" یہ خدا کا کُلّی قانون ہے جس میں کسی کی استثنا نہیں۔ حتّٰی کہ خود نبیٔ اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (۳۹/۳۰) "تو بھی مرنے والا ہے اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں۔"

(ج) یہ بھی صحیح نہیں کہ موت کے بعد زندگی صرف مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے ہے، اوروں کے لئے نہیں۔ موت کے بعد زندگی ہر ایک کے لئے ہے۔ یہ حقیقت ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ مومن اور کافر ہر ایک کو مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے، کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ (۲/۲۸) "تم خدا کا کس طرح انکار کر سکتے ہو۔ تم مُردہ تھے۔ اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر وہ تم پر موت طاری کرے گا اور پھر تم زندہ رہو گے۔" اس آیت میں تو مخاطب بھی کفار ہیں۔

مقتولین فی سبیل اللہ کے زندہ ہونے کا خصوصیت سے ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ منافقین کا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ لوگ جنگ میں نہ جاتے تو موت سے بچ جاتے۔ اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِھِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا

مَا قُتِلُوْا "ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خود میدانِ جنگ میں نہیں گئے۔ گھروں میں بیٹھے رہے۔ اور ان کے بھائی بند (مجاہدین) جو میدان میں گئے ان کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہنا مانتے (اور جنگ میں نہ جاتے) تو قتل نہ ہوتے۔" اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ اوّل تو یہ بتاؤ کہ کیا تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳/۱۶۷) "اگر تم اس بات میں سچے ہو تو اپنے آپ سے موت کو ہٹا کر بتاؤ۔" اور دوسرے یہ کہ جو لوگ حق و صداقت کی راہ میں جان دیتے ہیں انہیں مُردہ مت سمجھو۔ مُردہ تو تم ہو جو ذلّت کی زندگی جی رہے ہو۔ حیات، مرگِ باشرف کا نام ہے اور مرگ، حیاتِ بے شرف کا نام۔ زندہ ہونے کو تو مرنے کے بعد مومن و کافر دونوں زندہ ہوتے ہیں۔ لیکن ایک زندگی اہلِ جہنّم کی ہے جس کے متعلق فرمایا کہ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى (۲۰/۷۴) "وہ اس میں نہ مرے گا نہ جیئے گا۔" اور ایک زندگی اہلِ جنّت کی ہے جس میں کیفیت یہ ہوگی ــ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ (۳/۱۷۰) "جو نعماء انہیں خدا کے فضل سے ملتی ہیں وہ ان سے بہت خوش ہوتے ہیں۔"

بہرحال، یہ واضح ہے کہ مقتولین فی سبیل اللہ کی وہ زندگی یہاں کی طبیعی زندگی جیسی نہیں۔ اس لئے کہ انسان کی طبیعی زندگی کے متعلق ہم سب کچھ سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کی اُس دنیا کی زندگی کے متعلق فرمایا وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲/۱۵۴) "اس کی کنہ و حقیقت تمہارے عقل و شعور میں نہیں آسکتی۔ دوسرے یہ کہ اُن کا اِس دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، کوئی کتنا ہی مقرّبِ بارگاہِ خداوندی کیوں نہ ہو، وہ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد نہ وہ ہماری پکار کو سُن سکتا ہے، نہ اس کا جواب دے سکتا۔ اس میں مقتولین فی سبیل اللہ کی بھی کوئی استثناء نہیں۔ (قرآن نے ایسی استثناء نہیں کی) اگر ان کی زندگی اور دوسرے مرنے والوں کی زندگی میں کوئی فرق ہے تو وہ فرق خدا کے ہاں ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ ــ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۳/۱۶۸) "وہ اپنے رب کے حضور زندہ ہیں۔" وہیں سے انہیں سامانِ نشوونما ملتا ہے۔ وہ اس احساس سے خوش ہوتے ہیں کہ ان کی اس عظیم قربانی سے پیچھے رہ جانے والے مومنین کے لئے ایسا معاشرہ قائم ہو گیا جس میں انہیں کوئی خوف اور حزن نہیں (۳/۱۶۹)۔ اس سے زیادہ ان کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ کسی مرنے والے کا دنیا والوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں رہتا۔ اس لئے "اولیاء اللہ" کے متعلق یہ عقیدہ کہ ہماری سنتے ہیں، ہماری مدد کو پہنچتے ہیں، غیر قرآنی ہے۔

اولیاء اللہ کی طرف جو کرامات منسوب کی جاتی ہیں ان کے متعلق آٹھویں باب میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم معجزات کے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن چونکہ حضور نبیٔ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ

حضورؐ کی طرف منسوب معجزات

کو امتِ محمدیہ کے لئے ہی نہیں، پوری نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ آپؐ کو کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ اگر آپؐ نے اپنی زندگی کے انقلاب آفریں کارنامے معجزات کی رُو سے سرانجام دیئے تھے تو آپؐ کی زندگی عام انسانوں کے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔ انسانوں کے لئے وہی امور اسوہ (نمونہ) بن سکتے ہیں جو انسانی حیثیت سے سرانجام دیئے گئے ہوں اور انہیں سرانجام دینا انسانوں کے بس کی بات ہو۔ مخالفین حضورؐ سے بار بار معجزہ طلب کرتے، تو اس کے جواب میں کہا جاتا کہ میرا معجزہ

معجزہ صرف قرآن ہے

صرف قرآن مجید ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے: وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول پر اس کے رب کی طرف سے (محسوس) نشانات (معجزات) کیوں نہیں اتارے گئے۔" قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ "ان سے کہو کہ معجزات خدا کے ہیں۔" یہ ساری کائنات اس کی خلاقیت کا معجزہ ہے۔ یہاں کا ذرّہ ذرّہ معجزہ ہے۔ سارے انسان مل کر بھی چاہیں تو گھاس کی ایک پتّی پیدا نہیں کر سکتے۔ باقی رہا میں، تو اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ "میرا منصب صرف یہ ہے کہ میں تمہیں زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں۔" یہ چیز میں اس کتاب کی رُو سے کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔ یہ کتاب سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ "کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے جو ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔" اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۲۹/۵۰-۵۱) "اس کتاب میں ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، خدا کی رحمت اور (انسانی مقصدِ زندگی کی) یاددہانی ہے۔" خدا کی یہ کتاب ایک زندۂ جاوید معجزہ ہے۔ یہ آج بھی اُسی طرح معجزہ ہے جس طرح نبیٔ اکرمؐ کے زمانہ میں معجزہ تھی۔ اس پر عمل پیرا ہونے سے ایسے نتائج مرتب ہوتے ہیں جو اقوامِ عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیں۔ اس میں جو نظامِ حیات پیش کیا گیا ہے، ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس جیسا نظام مرتب نہیں کر سکتے۔ مخالفین کو چیلنج دیا جاتا ہے کہ تم اس قرآن کی مثل کوئی کتاب مرتب کر کے دکھاؤ۔ پوری کتاب نہیں تو چند ایک آیات ہی سہی۔ حضورؐ کی طرف سے بار بار اس چیلنج کو دہرایا گیا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسے قبول نہ کیا حالانکہ ان سے کہا گیا تھا کہ اس کے لئے تم سب کے سب مل کر بھی کوشش کر کے

دیکھ لو اور جی چاہے تو اپنے ساتھ اور لوگوں کو بھی ملا لو۔ وہ اس چیلنج کو قبول کرنے سے عاجز آگئے۔ اسی کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ قرآن کا یہ چیلنج انہی مخاطبین تک محدود نہیں تھا، قیامت تک کھلا ہے۔ لیکن اس چودہ سو سال کے عرصہ میں بھی کسی نے اسے قبول نہیں کیا۔

سُورج گہن کا واقعہ

ضمناً، حضورؐ کی زندگی میں ایک واقعہ ایسا سرزد ہوا جسے ان لوگوں نے آپؐ کا معجزہ سمجھ لیا۔ روایات میں ہے کہ آپؐ کے ایک صاحبزادہ کا چھوٹی سی عمر میں انتقال ہوا تو اتفاق سے اس دن سورج کو گرہن لگ گیا۔ وہ تو پھر بھی زمانۂ جاہلیت تھا، اگر اس قسم کا واقعہ کہیں آج بھی سرزد ہو جائے تو دیکھئے لوگ کس طرح اس شخص کی پرستش نہیں شروع کر دیتے؟ وہ لوگ گروہ در گروہ حضورؐ کے پاس آئے اور بیک زبان کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ خدا کے سچے رسول ہیں۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ بات میرے لئے موجبِ ہزار مسرت ہے کہ تم لوگ حقیقت کے قائل ہو گئے ہو۔ لیکن میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ہوا کس طرح سے ہے؟ کل شام تک تو تم میری اس قدر مخالفت کرتے تھے۔ آج تمہارے اندر اتنا بڑا انقلاب کیسے واقعہ ہو گیا؟ انہوں نے کہا کہ آپؐ کے رسول ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کون سا ہو سکتا ہے کہ آپؐ کے غم میں سورج نے بھی ماتمی لباس پہن لیا ہے۔

غور فرمایئے کہ یہ مقام کتنی بڑی آزمائش کا تھا۔ فریب کار نہ بھی سہی، اگر کوئی نیک نیت ذرا سا غلط اندیش ہوتا تو ان کے اس جواب پر خاموشی اختیار کر لیتا اور اپنے آپ کو یہ جھوٹا اطمینان دے لیتا کہ میری خاموشی سے اتنی بڑی قوم حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتی ہے تو ایسا کیوں نہ ہونے دیا جائے۔ جب یہ قوم اسلام قبول کرے گی تو رفتہ رفتہ ان کی ذہنی تربیت بھی ہو جائے گی۔

لیکن، حضورؐ حسنِ کردار کے جس بلند مقام پر فائز تھے اس کی رُو سے آپؐ نے اس سے ذرا بھی فائدہ نہ اُٹھانا چاہا اور ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر آپ لوگوں کے اسلام لانے کی وجہ یہ ہے تو یہ تمہاری غلط نگہی ہے۔ سورج اور چاند کو گہن خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق لگتا ہے۔ کسی کی موت اور حیات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا سمجھنا جہالت ہے۔ اور جو ایمان بر بنائے جہالت لایا جائے اسے ایمان کہا ہی نہیں جا سکتا۔

کرامات کو قربِ الٰہی کی دلیل قرار دینے والے ذرا اس واقعہ پر غور فرمائیں اور دوسری طرف وہ لوگ بھی جو۔ دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز۔ کو زندگی کا اصول قرار دے کر ایسے مقامات پر یا تو خاموشی اختیار کر لیتے ہیں یا گول مول بات کر کے ان کی فریب خوردگی کو پختہ کر دیتے ہیں اور اپنے اس مسلک کو اسلام کی عظیم خدمت

قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر حق کے لئے کوئی باطل ذریعہ اختیار کیا جائے، خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ ہو، تو حق، حق نہیں رہتا، باطل ہو جاتا ہے۔ قرآنِ مجید، ذریعہ اور مقصد میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے ــــ اور بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ان صوفیاء کرام نے اپنی کرامات کے ذریعے شدّ و مد سے اسلام پھیلایا اور ہزاروں لاکھوں کافروں کو مسلمان بنا دیا، وہ غور کریں کہ سیرتِ نبیٔ اکرمؐ سے متعلق مندرجہ بالا واقعہ کی روشنی میں اس دلیل کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ اوّل تو یہی دعوےٰ محتاجِ تحقیق ہے کہ ان حضرات نے واقعی اسلام پھیلایا اور کافروں کو مسلمان کیا۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو (معاف فرمائیے) ان حضرات نے جس قسم کا اسلام پھیلایا اس کا اندازہ ہم مسلمانوں کے اسلام سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کے لائے ہوئے اسلام کے وارث ہیں۔ یہی اسلام تو ہے جو صحیح اسلام کے راستے میں پہاڑ بن کر کھڑا ہے۔ اس اسلام کی ایک جھلک آپ سابقہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں۔

اور یہ حقیقت بھی بڑی دلچسپ ہے کہ اسلام پھیلانے کے اس قسم کے واقعات کو ان اولیاء کرام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو پہلے گزر چکے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی تو ایسے حضرات موجود ہیں جنہیں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ ان کے ہاتھوں پر کتنے غیر مسلم ایمان لاتے ہیں؟ غیر مسلموں کے اسلام لانے کا تو معلوم نہیں، لیکن ہماری نئی نسل کے نوجوان ان "اولیاء اللہ" کی وجہ سے جس قدر اسلام سے برگشتہ ہو رہے ہیں، وہ تو ہمارے سامنے ہے۔

یہ ضمنی گوشہ تھا۔ بات حضور نبیٔ اکرمؐ کے معجزات کی ہو رہی تھی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، حضورؐ نے ایک معجزہ تو قرآنِ کریم کا پیش کیا اور ایک معجزہ اور بھی پیش کیا۔ بلکہ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو حضورؐ نے اپنا معجزہ صرف ایک ہی پیش کیا۔ قرآنِ کریم تو خدا کی کتاب تھی جس میں حضورؐ کی کوشش و کاوش یا فکر و خیال کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس لئے قرآنِ کریم حضورؐ کا معجزہ نہیں تھا بلکہ خدا کا نازل کردہ معجزہ تھا۔ حضورؐ کا معجزہ وہ تھا جس کا تعلق سراسر آپؐ کی ذات سے تھا۔

حضورؐ کا معجزہ

اور یہ نکتہ بڑا اہم ہے۔ مخالفین حضورؐ سے پوچھتے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوائے نبوّت میں سچے ہیں۔ اس کے جواب میں آپؐ نے ان سے کہا کہ میں تم میں کوئی نو وارد نہیں، اجنبی نہیں، کہیں باہر سے نہیں آیا۔ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶) "میں نے اپنے اس دعوےٰ سے پہلے ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے۔ ذرا عقل و فکر سے کام لو اور بتاؤ کہ اس قسم کی زندگی جھوٹے کی ہوتی ہے یا سچے کی۔ اگر تمہاری شہادت یہ ہے کہ اس قسم کی زندگی سچے انسان کی ہوتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شباشب اتنا بڑا جھوٹ بولنے لگ جائے؟

حضورؐ نے اپنے دعوےٰ کی صداقت کی شہادت میں اپنی سابقہ زندگی یعنی زمانہ قبل از نبوّت کی زندگی کو پیش

فرمایا۔ اور کسی شخص نے اس کے خلاف انگلی تک نہ اٹھائی۔ یہ تھا حضورؐ کا وہ معجزہ جس کا اعتراف حضورؐ کے شدید ترین مخالفین کو بھی کرنا پڑا۔ اور یہی تھی حضورؐ کی وہ عظمتِ کردار جس کی شہادت خود خدا نے یہ کہہ کر دی کہ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴) "یقیناً آپؐ عظمتِ کردار کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔" قرآن کریم نے حضورؐ کی "روحانی قوتوں" کا کوئی ذکر نہیں۔ اخلاق و کردار کی بلندی ہی کا ذکر آیا ہے اور اسی کو نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے جب کہا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱)۔ اور اسی اسوۂ حسنہ کی تبع تھی وہ جماعتِ مؤمنین جس نے اپنی پاکیزگیٔ کردار اور مجاہدانہ سعی و عمل سے چند سال کے عرصے میں انسانی دنیا میں ایسا عظیم انقلاب برپا کر دیا جسے ساری دنیا آج تک معجزہ قرار دیتی چلی آ رہی ہے۔ یہی تھے وہ مجاہدین جنہیں صحیح معنوں میں "اولیاء اللہ" کہا جا سکتا ہے۔ وہ جن کے ان انقلاب آفریں کارناموں کی بنا پر ساری کائنات میں یہ نشیدِ جانفزا گونج اٹھی تھی کہ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۳۳/۴۳) "اللہ اور اس کے ملائکہ تم پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں غلط نظامِ زندگی کی تاریکیوں سے نکال کر اقدارِ خداوندی کی درخشندہ اور تابناک فضاؤں میں لے آئے۔" رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔ یہ حضرات نہ تصوف کے لفظ تک سے آشنا تھے، نہ روحانیت کی اصطلاح تک سے واقف۔ نہ ان سے (نام نہاد) کرامات سرزد ہوتی تھیں اور نہ ہی وہ لوگوں کو تعویذ گنڈے دیتے تھے۔ ان کے ایمان اور اعمالِ حسنہ کا ایک ہی نتیجہ تھا جسے قرآن نے استخلاف فی الارض سے تعبیر کیا۔ تفصیل اس کی آئندہ باب میں ملے گی۔